QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 04 (2025)

بانو قدسیہ کا ناول راجہ گدھ: اخلاقی زوال اور روحانی انحطاط کا مطالعہ

BANO QUDSIA'S NOVEL RAJA GIDH:A STUDY OF MORAL DECLINE AND SPIRITUAL DEGENERATION

Sadaf Sidiq
M.Phil Urdu, University of Southern Punjab, Multan
uzairatif17@gmail.com
Muhammad Usman
M.Phil Urdu, University of Southern Punjab, Multan
mychand74@gmail.com
Dr Munawar Amin
Assistant Professor, Department of Urdu
University of Southern Punjab, Multan
drmunawaramin143@gmail.com

ABSTRACT

Bano Qudsia was a distinguished Urdu fiction writer and thinker who, through her creative work, profoundly explored the spiritual, moral, and social dimensions of human life. Her fiction reflects a deep synthesis of religion, mysticism, ethics, and psychology. Among her major novels are ''Raja Gidh''.The greatest acclaim for its symbolic study of the decline of the human soul and moral decay. The author presents spirituality not merely as a religious belief but as a moral and existential philosophy that guides humanity from material degeneration toward inner purification. Thus, ''Raja Gidh'' represents Bano Qudsia's intellectual vision, one that unites Sufism, ethics, and social consciousness into a cohesive narrative. Her work not only defines the spiritual direction of the Urdu novel but also compels readers to turn inward and reflect on the moral and metaphysical aspects of their own existence.

Keywords: Novel, Raja Gidh , Moral ,Decline , Spiritual Degeneration, Human life, Sufism, Purification , Symbolic Study, Metaphysical.

بانو قدسیہ اردو ادب کی ممتاز فکشن نگار تھیں۔ جنہوں نے اپنے تخلیقی کام (ناول اور افسانہ) کے ذریعے انسان کے روحانی، اخلاقی اور سماجی پہلوؤں کو گہرائی سے اجاگر کیا۔ ان کے فکشن میں مذہب، تصوف، اخلاقیات اور انسانی نفسیات کا امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں عورت و مرد کے تعلق، عشق، ایمان، اور روحانیت جیسے موضوعات کو فکری گہرائی کے ساتھ پیش کیا، جس سے ان کا فکشن محض ادبی نہیں بلکہ فکری و فلسفیانہ جہت بھی اختیار کر گیا۔ بانو قدسیہ کے نمایاں ناولوں میں سب سے زیادہ شہرت ''راجہ گدھ'' کو حاصل ہوئی جو انسانی روح کے زوال اور اخلاقی انحطاط کا علامتی مطالعہ ہے۔

بانو قدسیہ کا ناول راجہ گدھ اردو ادب کا وہ فکری و علامتی متن ہے جو انسان کے باطنی زوال اور روحانی خلا کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہ ناول صرف ایک عشق کی المیہ داستان نہیں بلکہ اخلاقی گراوٹ اور روحانی انحطاط کا فلسفیانہ تجزیہ بھی ہے۔ بانو قدسیہ نے اس ناول میں "حلال و حرام کی غذا" کا نظریہ پیش کر کے انسان کی اخلاقی ساخت کو ایک نئی جہت دی۔ ان کے نزدیک انسان کے اخلاقی اعمال اور نفسیاتی رویے اس کی روحانی حالت کا مظہر ہیں۔ ناول کے کردار، خصوصاً قیوم، سیمی شاہ اور پروفیسر سہیل، انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بظاہر یہ کردار معاشرتی، تعلیمی اور رومانوی زندگی کے تناظر میں متحرک ہیں، لیکن ان کے باطن میں ایک ایسا انتشار موجود ہے جو جدید انسان کی گمشدہ روحانی سمت کو ظاہر کرتا ہے۔

بانو قدسیہ نے اس ناول میں ہمارے معاصر معاشرے کی ایک گہری اور دردناک تصویر کشی کی ہے، جہاں ذات کی داخلی شکست و ریخت، اخلاقی اقدار کا مسلسل زوال اور مجموعی طور پر سماج کی بے سمت اور بے راہ روی کو ایک آئینہ دار کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول اس پر آشوب اور انتشار زدہ دور کی ایک واضح علامت ہے، جو ہمیں یہ ادراک دلاتا ہے کہ ہماری تہذیبی اور اخلاقی اقدار اندر سے اس قدر سڑ گئی ہیں اور کمزور ہو چکی ہیں کہ اگر اب بھی اس صورت حال میں فوری اور مؤثر تبدیلی کا اہتمام نہ کیا گیا تو پورا

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 04 (2025)

معاشرہ اپنی حتمی موت کی طرف بڑھ جائے گا۔اس موت کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان، جو اپنے طویل فکری اور تہذیبی ارتقاء کے باوجود، بالآخر اپنی ذات کی داخلی کمزوریوں اور تضادات کے ہاتھوں شکست کھا جائے گا، حالانکہ جبلی اور فطری طور پر وہ ہمیشہ سے ابدیت اور لافانی حیثیت کی خواہش کرتا رہا ہے۔ بانو قدسیہ نے اس ناول میں انسان کی تخلیق کے بنیادی سوالات، اس کے ذہنی اور فکری ارتقاء کی پیچیدگیوں، اس کی جنسی نفسیات کی گہرائیوں، تہذیب اور مذہب کی تشکیل، اور تصوف کی روحانی جہتوں سے بحث کی ہے۔ مگر ان تمام موضوعات کا تانا بانا وہ فکری سطح پر تصوف اور روحانیت سے جوڑ دیتی ہیں، اور اپنے ایک اہم کردار پروفیسر سہیل کی وساطت سے قاری پر یہ گہرا تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہمارے تمام تر معاشرتی عوارض اور بحرانوں کا واحد اور مؤثر حل روحانیت میں پوشیدہ ہے۔ یہ روحانیت ہی ہے جو انسان کو اس کے داخلی تضادات سے نجات دلاتی ہے، ورنہ وہ گدھ کی طرح آسمان میں منڈلاتا رہتا ہے اور اپنی سرشت کے اعتبار سے حرام کاری کا کھیل کھیلتا ہے، جو اسے مزید تباہی کی طرف دھکیلتا ہے۔

بانو قدسیہ اس ناول ''راجہ گدھ'' کے ابتدائی حصے میں سیمی اور قیوم کے درمیان ہونے والی ملاقات سے کئی پہلوؤں کو سامنے لاتی ہیں۔ یہ دراصل انسان کے اخلاقی، نفسیاتی اور روحانی زوال کی ایک علامتی جھلک پیش کرتی ہے۔ جو قیوم کے وجودی خلا اور اس کے اندر کی سرد مہری کو ظاہر کرتا ہے۔اس کے لیے زندگی اب صرف معمولات کا نام ہے، جذبات یا احساسات کی کوئی جگہ نہیں۔ سیمی کی اچانک آمد اس کے ماضی کے ایک دبے ہوئے باب کو کھول دیتی ہے، مگر قیوم کا ردعمل سرد اور تجزیاتی ہے، جیسے وہ ایک زندہ انسان کے بجائے ایک تجربے کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

سیمی کے کردار میں بانو قدسیہ نے ایک ایسی عورت کو مجسم کیا ہے جو محبت کی شکست، خود فریبی، اور روحانی خلا کا شکار ہے۔ قیوم جب اسے دیکھتا ہے تو کہتا ہے:

''وہ پہلے سے زیادہ دُبلی، لمبی اور زرد لگ رہی تھی... وہ پہلے جیسی نہ تھی مگر ظاہراً کوئی خاص تبدیلی بھی نہیں آئی تھی۔''(1)

اس اقتباس میں سیمی کی بیرونی اور اندرونی شکست دونوں کا عکس ملتا ہے۔ وہ اب بھی وہی عورت ہے مگر اس کی آنکھوں کی زردی، چہرے کی تھکن اور جسم کی کمزوری اس کے اندر کے ٹوٹے پھوٹے وجود کی علامت ہے۔اس کے مکالمے اس کے ذہنی انتشار اور جذباتی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں، جیسے جب وہ کہتی ہے:

''میں بہادر لگتی ہوں لیکن صرف لگتی ہوں، اندر سے نہیں ہوں، قیوم پلیز فار مائی سیک، آفتاب کی بیوی کو دیکھ کر آنا۔''(2)

یہ جملہ سیمی کے اندر چھپے خوف اور حسد دونوں کو عیاں کرتا ہے۔ قیوم کا رویہ سیمی کے مقابلے میں ظاہراً متوازن مگر باطناً کھوکھلا ہے۔ وہ ہر بات کا جواب منطق سے دیتا ہے، جذبات سے نہیں۔ تو اس کے لہجے میں ایک تھکا ہوا فلسفہ بولتا ہے۔ یہ ناول بانو قدسیہ کے سماجی اور اخلاقی شعور کی نمائندگی کرتا ہے، جس کے مطابق مشرقی انسان محبت میں بھی سماجی اصولوں اور اخلاقی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ قیوم، سیمی کو سمجھوتے کا مشورہ دیتا ہے مگر خود اپنے اندر کے انتشار سے سمجھوتہ نہیں کر پاتا۔ سیمی اور قیوم کی یہ ملاقات اسی زہر کے اثرات کی تمثیل ہے، جہاں محبت کی یاد، ماضی کی شکست اور اخلاقی بوجھ تینوں مل کر انسان کے اندر کی روشنی بجھا دیتے ہیں۔

ناول کے ان مرکزی کرداروں میں سے سیمی شاہ، اس معاشرتی زوال کی ایک زندہ مثال ہے۔ وہ اپنے محبوب کو کھونے کے بعد مسوکیت یا خود کو اذیت دینے کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے، جہاں اسے اس اذیت سے ایک عجیب قسم کی مسرت اور تسکین حاصل ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ کیفیت اسے شدید ذلت اور خود کم بینی کا احساس بھی دلاتی ہے۔ یہ عشقِ لاحاصل کا انجام انسانی سوچ اور نفسیات کے اس تاریک پہلو کو نمایاں کرتا ہے، جہاں شر اور خیر کو ایک دوسرے سے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کر دیا جاتا ہے، اور نتیجتاً معاشرہ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی منطقی اور نفسیاتی وضاحت سیمی کے کردار کے حوالے سے ناول میں کچھ یوں پیش کی گئی ہے کہ عموماً محبت میں ناکامی کا شکار افراد اپنی ذات کی تذلیل اور خود کو تباہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ایک بند سپی سے برآمد ہونے والے آبدار موتی کو اگر اصل خریدار نہ ملے تو وہ خود کو ریت کے حوالے کر دیتا ہے، جہاں لہروں کے ساتھ بہنے اور گم ہونے کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح یہ پورا منظر نامہ معاشرے کے بے وقعت، بے سمت اور بے معنی ہونے کا زندہ شاہد بن جاتا ہے، جہاں افراد اپنی داخلی قدر کھو کر اجتماعی تباہی کی طرف بڑھتے ہیں۔

دوسری جانب، قیوم کا کردار بھی اسی طرح کی داخلی جدوجہد اور عشقِ لاحاصل کی تصویر ہے، جو خود عابدہ اور پھر امتل سے باری باری محبت میں مبتلا ہو کر ایک سراب کے پیچھے بھاگتا نظر آتا ہے۔ وہ مسلسل ایک ایسی حقیقت کی تلاش میں رہتا ہے جو اسے کبھی نہیں ملتی، اور یہ جدوجہد اسے مزید بے چین اور بے سمت کر دیتی ہے۔ حقیقت میں سیمی شاہ کا معاملہ قدرے مختلف اور گہرا ہے، کیونکہ وہ اپنے پس منظر کی پیداوار ہے۔ وہ ایک ایسے بیوروکریٹک گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جہاں روپیہ پیسہ، عزت، دولت اور مادی آسائشیں سب کچھ دستیاب ہیں، لیکن فرد کا فرد سے جذباتی اور روحانی لگاؤ مکمل طور پر غائب ہے۔ یہ گھرانہ مادی سطح پر تو متحد ہے، مگر روحانی اور جذباتی جہتوں میں بالکل خالی اور بنجر ہے۔

مصنفہ نے آگے چل کر ناول میں ائیر پورٹ کا منظر پیش ہے جو محض رخصتی اور ملاقات کی جگہ نہیں بلکہ انسانی باطن کی بے سمتی، حرص اور خود غرضی کا مظہر کے طور پر دکھایا ہے۔ جہاں لوگ محبت اور جذبات کے نام پر دراصل حسد، موازنہ اور مادّی تفاخر میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے نزدیک یہی وہ مقام ہے جہاں روحانیت ماند پڑتی ہے اور انسان اپنے اندر کی روشنی سے کٹ کر صرف ظاہری تعلقات میں الجھ جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "ائیر پورٹ کا مال بچھڑنے اور ملنے کی وجہ سے جذبات سے بوجھل ہو رہا تھا۔۔۔ بھائیوں کے دلوں میں حسد تھا۔۔۔ چچا اپنے بھائی کی اولاد کے ساتھ اپنی اولاد کا موازنہ کر رہے تھے۔"(3)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ بظاہر خاندانی محبت کے مناظر کے پیچھے خود غرضی اور رقابت کی تہہ موجود ہے، جو روحانی گراوٹ کی علامت ہے۔ اس کے ساتھ شام کے وقت کا منظر ایک گہری روحانی علامت بن جاتا ہے۔ شام کا اترنا دراصل انسان کی روح پر اندھیرے کے چھا جانے، روشنی کے زوال، اور ایمان کی کمزوری کی تمثیل ہے۔ بانو قدسیہ کے نزدیک انسان فطرت سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی اپنے اندر کے سکون اور اطمینان سے محروم ہوتا جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "شام خوف اور گمان سے بھری چلی آتی ہے... روشنی رہتی ہے لیکن نور نہیں رہتا۔ اندھیرے میں سیاہی پوری طرح حلول نہیں کر پاتی، ٹھٹکیاں بن کہ سب طرف بکھر جاتی ہے۔"(4)

اس اقتباس میں ''روشنی'' روحانیت کی علامت ہے، جب کہ ''نور کا نہ رہنا'' انسان کے اندر سے الٰہی تعلق کے ختم ہونے کا استعارہ ہے۔ بانو قدسیہ نے آفتاب کے کردار میں اخلاقی زوال کو بھی نمایاں کیا ہے۔ آفتاب کی شخصیت جدید تعلیم یافتہ مگر اخلاقی لحاظ سے کمزور انسان کی نمائندہ ہے جو محبت کو وقتی جذبات اور تعلق کو محض سماجی درجہ سمجھتا ہے۔ سیمی کی سادگی اور روحانی پاکیزگی کے مقابلے میں آفتاب کی سطحی مادیت قاری کے سامنے واضح ہو جاتی ہے۔

جدید تہذیب کے ظاہری چمک دمک کے پیچھے چھپے اخلاقی انہدام کو ظاہر کیا گیا ہے۔ سیمی کا دکھ، اس کی خاموشی اور اس کے آنسو دراصل اس معاشرتی خالی پن کا استعارہ ہیں جہاں عشق اپنی روحانی معنویت کھو چکا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ صرف آنسو اس کی گالوں پہ بہنے لگے۔ وہ چغتائی کی تصویروں میں بنی ہوئی غزال رولڈ کیوں کی طرح اس وقت عشق طلب تھی۔ اس کی روح کا ہر مولی کیوں زخمی تھا اور وہ عشق کے پانیوں میں یوں اتر رہی تھی جیسے شہر سیلاب کے پانیوں غرقاب ہوتے ہیں۔"(5)

یہ منظر صرف ایک عورت کے المیے کی تصویر نہیں بلکہ ایک پوری نسل کے روحانی زوال کی علامت ہے۔ آخر میں راوی کا احساس کہ وہ ''ایک ایسا ہی انجن ہے جس کی منزل کوئی نہیں'' اس بات کا اشارہ ہے کہ جدید انسان اپنی دوڑتی بھاگتی زندگی میں منزل، سکون اور روحانی مرکز کھو چکا ہے۔

بانو قدسیہ کے فکری وژن کا عکاس ہے کہ جب انسان روحانیت، اخلاق اور تعلقِ الٰہی سے کٹ جاتا ہے تو وہ بظاہر ترقی یافتہ ہونے کے باوجود اندر سے خالی، تنہا اور غیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ ''راجہ گدھ'' میں بانو قدسیہ نے مادّیت کے اس دور میں انسان کے اندر پیدا ہونے والے روحانی خلا اور اخلاقی انہدام کو نہایت گہرے علامتی اور فکری اسلوب میں پیش کیا ہے۔

انسانی فطرت پر مادی اقدار کے غلبے کی وجہ سے اس کی داخلی تقسیم اور دو حصوں میں بٹ جانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیمی شاہ، جو ایک انتہائی حساس اور جذباتی نوعیت کی لڑکی ہے، دنیا سے بیزار اور گوشہ نشین ہو جاتی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ابتدا میں نیند کی گولیاں اور خواب آور ادویات کا استعمال شروع کر دیتی ہے، پھر بالآخر ایک دن خودکشی کا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ خودکشی ایک جانب اس کے خاندانی اور پس منظر کے عذابوں اور تکلیفوں کو بیان کرتی ہے، جو مادی آسائشوں سے بھرپور مگر روحانی طور پر خالی تھا، اور دوسری جانب اس بات پر زور دیتی ہے کہ عورت کی ذات مرد کی ذات سے ایک خاص قسم کے مرکز یا نیوکلیس سے جڑی ہوتی ہے۔ اگر اس مرکز کو اس کی ذات سے الگ کر دیا جائے تو وہ شدید بے چینی اور اضطراب کا شکار ہو جاتی ہے، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی پیدائش سے لے کر موت تک کی پوری زندگی اس مرکز سے جڑے رہنے اور متحد ہونے کی جدوجہد پر مشتمل ہے۔ اب قیوم، جو عابدہ اور امتل کو اسی مرکز کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور ان سے جذباتی طور پر جڑنے کی کوشش کرتا ہے، تو دونوں ہی عورتیں اس سے کئی قدم پیچھے ہٹ جاتی ہیں، کیونکہ قیوم خود راجہ گدھ کی طرح ان کی ذاتوں کو نوچنے اور ٹکڑے کرنے والا بن جاتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کا حقیقی نیوکلیس قیوم کی ذات کی دوسری جانب ہے، یعنی وہ اسے اپنا مرکز تسلیم نہیں کر سکتیں۔ دراصل، عابدہ پہلے سے ہی ایک شادی شدہ عورت ہے،

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 04 (2025)

اور اس کا شوہر اسے ہر قسم کی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں پہنچاتا ہے، مگر وہ تمام اذیتیں برداشت کرتی ہے صرف اس لیے کہ اسے ایک بچہ چاہیے۔ اس مقصد کی خاطر وہ اتنا آگے بڑھ جاتی ہے کہ قیوم سے جسمانی تعلق قائم کر لیتی ہے، لیکن جب قیوم یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر کے اس سے شادی کر لے، تو وہ فوراً اپنے شوہر کے ساتھ وہاں سے چلی جاتی ہے اور قیوم کو تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ یہی صورت حال امتل کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ وہ اس بازار کی پیداوار ہے جس کے وجود سے سب لوگ بیزار اور نفرت زدہ ہیں، مگر ساتھ ہی سب اس کے اسیر اور گرفتار بھی ہیں۔ امتل کی بیماری یہ ہے کہ اگر کوئی اسے اپنا بھی لے تو وہ خود کو ٹھکرا دی جانے کی خوف میں رہتی ہے، اور پھر وہی بازار اس کی تقدیر کا حصہ بن جاتا ہے۔ لیکن لاشعوری طور پر وہ اپنے حقیقی نیوکلیس کی تلاش میں نہ جانے کتنے لوگوں سے رابطے قائم کرتی رہتی ہے، ریڈیو کے پروڈیوسرز اور دیگر افراد کے قریب رہتی ہے، قیوم کو بھی اپنے سے الگ نہیں ہونے دیتی، مگر جب قیوم اسے مکمل طور پر اپنانے اور شادی کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو وہ ایک دم سے اپنا دامن چھڑا لیتی ہے اور اس سے دور ہو جاتی ہے، کیونکہ قیوم اس کا حقیقی نیوکلیس نہیں بن سکتا تھا۔ بالآخر وہ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں موت کی نیند سو جاتی ہے، جو اس کی داخلی جدوجہد اور بے سمتی کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔

قیوم کے لیے یہ ایک انتہائی جذباتی اور کرب ناک لمحہ ثابت ہوتا ہے، جہاں وہ آہستہ آہستہ حقیقت کو سمجھنے اور قبول کرنے لگتا ہے، اور پھر روشن سے شادی کر کے اپنی زندگی میں سکون اور استحکام حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اچانک ایک اور شدید دھچکا لگتا ہے جب روشن حاملہ ہو جاتی ہے، اور یہ حمل اس کا نہیں بلکہ افتخار کا ہے، جو سعودی عرب میں مقیم ہے۔ قیوم اسے افتخار کے حوالے کر کے خود مکمل طور پر علیحدہ ہو جاتا ہے، جو اس کی داخلی تنہائی اور شکست کو مزید گہرا کر دیتا ہے۔

مصنفہ نے عابدہ اور راوی (قیوم) کے مابین فکری اور مزاجی فرق کو بھی بیان کیا ہے، لیکن دراصل یہ دو مختلف انسانی رویوں روحانی سادگی اور عقلی مغالطے کے تصادم کی کہانی ہے۔ بانو قدسیہ نے اس بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ علم، فلسفہ، یا منطق انسان کو روحانی طمانیت نہیں دے سکتے، بلکہ اس کی سادگی، ایمان اور اخلاقی توازن ہی اسے باطنی سکون بخشتے ہیں۔

ناول میں مختلف جگہوں پر بانو قدسیہ جدید مغربی فکر پر تنقید کرتی نظر آتی ہیں، وہ سمجھتی ہیں کہ اس نے انسان کے روحانی توازن کو بگاڑ دیا ہے۔ راوی کی علمی اور فکری گہرائی کے باوجود، وہ اپنی روح کے خلا کو پُر نہیں کر سکتا۔ اس کی عقل کا زوال دراصل اس کے اخلاقی زوال کا پیش خیمہ ہے۔ وہ سچائی اور نیکی کو فلسفیانہ تجزیے کا موضوع بناتا ہے، مگر ان کے عملی اور روحانی جوہر سے محروم رہتا ہے۔

دوسری طرف، عابدہ مذہبی عقائد میں سادہ مگر خالص ایمان رکھتی ہے۔

"ڈر جاتی تو آیت الکرسی پڑھنے لگتی، خیالات غلط راستے پر گھٹنے تو سورہ الناس پڑھ کر سینے پر دم کر لیتی۔" (6)

یہ سطور اس کی روحانی وابستگی اور ایمان کی سچائی کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ سادہ مذہبی عورت ہے جس کے لیے نیکی اور بدی الگ الگ خانوں میں بند ہیں۔ یعنی وہ ابہام سے پاک ہے، یقین کی دنیا میں رہتی ہے۔ بانو قدسیہ نے اسی یقین کو روحانیت کا مرکز قرار دیا ہے، جب کہ راوی کے فکری ابہام کو زوالِ اخلاق و روحانیت کی علامت بنایا ہے۔

بانو قدسیہ کے نزدیک روحانیت کا جوہر کسی نمایاں تعلیم یا فلسفیانہ فکر میں نہیں بلکہ عام انسان کی سادگی، خلوص اور داخلی روشنی میں پوشیدہ ہے۔ عابدہ کا کردار اس "سلیٹ" کی طرح ہے جس پر ظاہری دھول کے باوجود کہیں نہ کہیں روحانی چمک باقی ہے، جب کہ راوی (قیوم) فلسفہ اور مغربی منطق میں الجھا ہوا ہے، جو انسان کو حقیقت سے دور لے جاتی ہے۔

ان دونوں کرداروں کے تقابل سے واضح ہوتا ہے کہ عقل جب ایمان سے الگ ہو جائے تو انسان توازن کھو دیتا ہے۔ راوی کا فلسفیانہ علم اسے سچائی کے قریب نہیں بلکہ اس سے دور لے جاتا ہے، جبکہ عابدہ کی ظاہری "مڈل کلاس" سادگی دراصل اس کے روحانی وقار کی نمائندہ ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"دراصل اس کا قالب جس میں وہ ڈھلی تھی اتنا مضبوط تھا کہ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ موم کی بنی ہے کہ پتھر کی۔" (7)

یہ جملہ بھی دراصل اس بات کا استعارہ ہے کہ روحانیت انسان کے ظاہر سے نہیں بلکہ باطن سے پہچانی جاتی ہے۔ بانو قدسیہ نے یہاں عورت کی روحانی پختگی کو ظاہر کی سادگی کے اندر چھپے ہوئے جوہر کے طور پر پیش کیا ہے۔

یوں بانو قدسیہ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جدید انسان کا زوال دراصل اس کی روحانیت سے بیگانگی ہے۔ جب علم، فلسفہ، اور تجربہ اخلاقی شعور سے منقطع ہو جائیں تو انسان "راجہ گدھ" بن جاتا ہے، ظاہری طور پر باشعور مگر باطنی طور پر مردہ۔ یہ بانو قدسیہ کے فکری کائنات کی بنیاد کو آشکار کرتا ہے۔ روحانیت انسان کی اصل شناخت ہے،

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 04 (2025)

اور جب یہ روحانیت مادیت، عقل پرستی، اور خود نمائی کے زیرِ اثر دب جائے تو انسان اپنی فطری پاکیزگی کھو دیتا ہے۔ عابدہ اور راوی کے مکالمے میں دراصل انسان کے اندر کے دو رخ ایمان اور شک، اخلاق اور خواہش، روشنی اور اندھیرا کا ازلی تصادم بیان ہوا ہے۔

ناول کے اگلے حصے میں مصنفہ نے امتل اور راوی (قیوم) کے تعلق کو نہ صرف جسمانی و جذباتی سطح پر بلکہ روحانی اور اخلاقی زوال کے استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔

امتل کا کردار انسانی روح کی اس کیفیت کی نمائندگی کرتا ہے جو گناہوں، محرومیوں، اور تجربات کے بوجھ تلے مردہ ہو چکی ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہے جو زندگی کے ہر ذائقے کو چکھ چکی ہے اور اب اس میں نیکی اور بدی کی تمیز مٹ چکی ہے۔ اس کے نزدیک جھوٹ اور سچ، پاکیزگی اور گناہ سب برابر ہیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں انسان روحانی بے حسی کے عالم میں داخل ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ نے امتِل کے کردار کے ذریعے اس بات کو ظاہر کیا کہ جب انسان اخلاقی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے تو روح کی لطافت ختم ہو جاتی ہے، اور وہ محض ایک ''سنتھیٹک فائبر'' بن کر رہ جاتا ہے ایک ایسا جسم جو انسان تو ہے مگر روحانی طور پر مر چکا ہے۔

> "سچ وہ صرف اس لیے بولتی تھی کہ اب جھوٹ اور سچ اس کے نزدیک بالکل برابر ہو چکے تھے۔
>
> وہ اپنے جسم سے بے پر، عزت و شہرت سے بے نیاز، روپے پیسے سے غنی تھی۔"(8)

روحانی زوال کی انتہا وہ مقام ہے جہاں انسان میں اخلاقی احساسات ختم ہو جاتے ہیں۔ امتِل کا کردار عورت نہیں بلکہ روحِ انسانی کی علامت ہے جو تجربات، خواہشات اور محرومیوں کے بوجھ تلے اپنے اصل جوہر سے محروم ہو چکی ہے۔

قیوم کا کردار ایک تعلیمی، فکری اور مغربی نظریات سے متاثر شخص ہے، مگر اس کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں انتشار اور خلا نمایاں ہے۔ امتل کے ساتھ اس کا رشتہ جسمانی وابستگی سے زیادہ ایک نفسیاتی سہارا ہے، لیکن اس رشتے میں نہ محبت ہے نہ روحانیت۔

یہ ایک ایسا رشتہ ہے جو اخلاقی بگاڑ اور روحانی تنہائی کا عکاس ہے۔ قیوم کا اندر ''بلال گنج'' کی پرانی دکان کی طرح ہے جہاں ہر چیز بکھری پڑی ہے مگر کسی شے میں جان نہیں۔ یہ علامت انسان کے اندرونی زوال کی ہے، جہاں روحانی روشنی بجھ چکی ہے۔

> "میرا دل بلال گنج کی ایسی دوکانوں سے مشابہہ تھا، جہاں ہر طرف پرانا لوہا بکھرا ہے۔ کاروں کی پرانی باڈیاں، نٹ بولٹ، گراریاں۔۔۔ لیکن تالے نہیں تھے نہ اپنے نہ پرائے۔"(9)

یہ منظر نامہ انسانی ذہنی بکھراؤ اور روحانی بے معنویت کا استعارہ ہے۔ بانو قدسیہ نے یہاں قیوم کے ذریعے یہ دکھایا کہ تعلیم اور شعور اگر روحانیت سے خالی ہوں تو وہ انسان کو نجات نہیں دے سکتے۔

ناول میں گدھ ایک علامتِ زوال ہے۔ وہ مخلوق جو مردار کھاتی ہے۔ قیوم اور امتل دونوں ''گدھ جاتی'' کے نمائندے ہیں یعنی وہ انسان جو اخلاقی و روحانی مردار پر پلتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے نزدیک یہ گدھ صرف فطری مخلوق نہیں بلکہ انسان کے اندر کے اخلاقی بگاڑ کا استعارہ ہے۔ ان کے درمیان کی قربت دراصل روحانی مردار خوری کا عمل ہے، جہاں انسان محبت کی تلاش میں گناہ کی وادیوں میں بھٹک جاتا ہے۔

امتل اور قیوم جیسے کردار دراصل جدید انسان کے المیے کی علامت ہیں، جو علم، تجربے، اور شعور کے باوجود خود کو روحانی طور پر گم کر چکے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں "راجہ گدھ "کا فلسفہ حرام رزق، اخلاقی زوال، اور روحانی تباہی ایک وجودی اور نفسیاتی جہت اختیار کر لیتا ہے۔

بانو قدسیہ نے قیوم کے مقابل ایک دوسرا اہم کردار پروفیسر سہیل کو تخلیق کیا ہے، جو اس شعور اور آگاہی کی علامت ہے جو شکوک و شبہات اور ذہنی الجھنوں کے راستوں سے گزر کر بالآخر تشکیل پاتا ہے۔ خود قیوم کو اپنے اندر کے راجہ گدھ ہونے کا شدید احساس ہے، اور وہ گناہوں اور غلطیوں کے راستے سے گزر کر کسی روحانی تلاش کی طرف رواں دواں ہے، اس لیے وہ پروفیسر سہیل کا دامن تھام لیتا ہے۔ قیوم کے سامنے اس کی پوری گھناؤنی اور تاریک زندگی پھیلتی چلی جاتی ہے، مگر وہ اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات اور حالات سے شدید طور پر متاثر اور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس کے اندر کا انسان بار بار یہ سوال اٹھاتا ہے کہ "کیا ہو گا؟" وہ بھی ایک شاہ کی طرح داخلی طور پر دولخت اور تقسیم زدہ ہے، اور اپنی ذات کے دونوں ٹکڑوں کو متحد کرنے کا آرزومند ہے۔ پروفیسر سہیل، جو امریکہ میں رہ کر آیا ہے اور جس کی نظر سے انسانی تاریخ، تہذیب اور سائنس کی تمام جہتیں گزر چکی ہیں، اپنے انکشافات سے قیوم کو چونکا دیتا ہے۔ وہ اسے واضح کر دیتا ہے کہ قیوم یا پورا معاشرہ جن خیالات، افکار اور مادی زنجیروں کا اسیر ہے، وہ سب درآمد شدہ اور بیرونی ہیں، اور ان کے روگ کا علاج صرف مشرق کے پاس ہے۔ وہ کہتا ہے:

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 04 (2025)

''مغرب کے پاس حرام و حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت رزق حرام جسم میں داخل ہوتا ہے۔ تو وہ انسان کے Genes کو متاثر کرتا ہے۔ رزق حرام میں ایک قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات شراب اور Radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزق حرام سے جو Genes نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں وہ لولے لنگڑے اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتی ہیں ان Genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کرلو رزق حرام سے ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں بتاؤ میں نے یہ بات مغرب کے علم سے مستعار لی ہے کہ مشرق سے؟'' (10)

پروفیسر سہیل کی گفتگو دراصل بانو قدسیہ کے فکری و روحانی زاویۂ نظر کی ترجمان ہے۔ ان کے یہ خیالات محض ایک فلسفیانہ تاثر نہیں بلکہ مذہب اور تصوف کے عمیق سچ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قیوم، سیمی شاہ، امتل، عابدہ، روشن اور آفتاب جیسے کردار اپنے اپنے انفرادی جنون، پاگل پن اور اعمال کے ذریعے اس نظریے کو واضح کرتے ہیں کہ انسان کا عمل دراصل اس کی باطنی تاریخ کا عکس ہوتا ہے۔ ان کرداروں کی نفسیاتی الجھنیں اور روحانی زوال دراصل ''رزقِ حرام'' سے پیدا ہونے والی اس دیوانگی کی علامت ہیں جو انسان کے شعور اور جسم دونوں کو متاثر کرتی ہے۔

پروفیسر سہیل جب جدید سائنس کو چیلنج کرتے ہیں تو وہ دراصل انسان کی روحانی جہت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ ان کے مطابق سائنس اگر جسمانی امراض کے علاج کے لیے دوا ایجاد کر سکتی ہے تو وہ یہ بھی کیوں نہیں جان پاتی کہ رزقِ حرام انسان کی روح، اس کے لہو اور اس کے جینز پر کیسے مہلک اثرات مرتب کرتا ہے۔ بانو قدسیہ اس نکتے کو بڑے روحانی انداز میں یوں بیان کرتی ہیں کہ رزقِ حلال سے جسم میں ایسی پاکیزہ لہریں پیدا ہوتی ہیں جو روح کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہیں، جب کہ رزقِ حرام سے ہر ذرے میں منفی ارتعاش جنم لیتا ہے جو انسان کو قبل از وقت شکستہ اور بے سکون بنا دیتا ہے۔

بانو قدسیہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ اگر سائنسی تحقیق سے روحانی پہلو نکال دیا جائے تو ایسی سائنس انسان کو مادی آسائش تو فراہم کر سکتی ہے مگر سکونِ قلب نہیں۔ انسان کی روحانی درماندگی کا علاج صرف ایمان، حلال رزق اور باطنی طہارت میں مضمر ہے۔ انہوں نے جنگل میں راجہ گدھ کے خلاف قائم کی گئی عدالت کے مناظر کے ذریعے اپنے مخصوص فکری زاویے کو معنی خیزی عطا کی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ: کیا انسان جسے بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ'' کی علامت سے تعبیر کیا اپنی سرشت کو بدلنے پر قادر ہے؟

بدی کا عنصر انسان میں کیوں اور کیسے پیدا ہوا؟

ابدیت کا خواہاں انسان خود کو ریزہ ریزہ کیوں کر دیتا ہے؟

اور کیا وہ اپنی موجودہ فطرت کے ساتھ کسی صورت ابدیت حاصل کر سکتا ہے؟

ان سوالات کے جوابات کے لیے ناول کے اس منظر پر غور ضروری ہے جہاں منصب سیمرغ کے روبرو کھٹ کھٹ بڑھئی ایک اہم بیان دیتا ہے:

''پہلے آقا انسان کی سرشت میں بدی نہ تھی، وہ فرشتوں کی طرح نیک اور آئینے کی طرح پاک تھا، لیکن ایک دن ابلیس نے موقع پا کر اس میں جھانکا۔ اس لمحے انسان کے اندر حق و باطل کی جنگ شروع ہوئی۔ خدا نے انسان کو موقع دیا کہ وہ اپنا آئینہ صاف کر لے۔ اس وقت سے حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ جنگ کا میدان انسان ہے۔ اللہ کی کائنات میں انسان ایسا ہے جو اپنی سرشت بدلنے پر قادر ہے اور اپنے آئینے کو صاف کر سکتا ہے۔ جیت اللہ کی ہوگی لیکن موقع ابلیس کو بھی برابر کا دیا جائے گا۔ آپ دیکھتے نہیں آقا، اس جنگ کی وجہ سے انسان کی کیا حالت ہوئی؟ اگر وہ دیوانہ ہے تو اس تضاد کے ہاتھوں، اور اگر فرزانہ ہے تو اس تضاد کی وجہ سے۔'' (11)

اسی طرح راجہ گدھ کا اپنا بیان بھی اسی نکتے کی تائید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے شروع میں میں اپنی فطری سرشت کے سہارے زندگی گزار رہا تھا۔ ایک روز درخت کے نیچے ایک جوگی آیا جس نے موت کو للکارا اور خدا کی طرح ابدی ہونے کی صدا لگائی۔ وہی جوگی بعد ازاں اسی درخت سے لٹکا ہوا ملا۔ میں نے جوگی کی گرہ کھولی تو اس کا لہو مجھ میں

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 04 (2025)

سرایت کر گیا۔اسی لمحے میری سرشت بدل گئی۔ میں موت سے خوفزدہ ہونے لگا۔ میری نسلوں نے حرام کھانا شروع کیا،ان پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ وہ خود سے ڈرنے لگے۔ ناپائیداری کے احساس نے انہیں کھالیا۔وہ ہمیشہ کے لیے دیوانے ہوگئے،اور ناپائیدار زندگی میں ہمیشہ کی بقا تلاش کرنے لگے۔

شروع میں عشقِ لاحاصل سے جو داستان شروع ہوئی تھی، بانو قدسیہ نے اسے آگے چل کر بے نام جستجو سے جوڑ دیا۔ انسان کی ناپائیداری کا احساس اور ابدیت کی خواہش دونوں اس کے باطن کی دیوانگی کا حصہ بن گئے۔ یہی دیوانگی انسان کو مسلسل نئے سوالات کی طرف لے گئی، مگر ان سوالات کے جوابات ہمیشہ نا تسلی بخش رہے، جس کے نتیجے میں اس کے اندر احساسِ محرومی، ذہنی انتشار اور فکری گمراہی جنم لینے لگے۔ یہی بے نام جستجو رفتہ رفتہ انسان کی دیوانگی کو انتہا تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں بانو قدسیہ کا فکری زاویہ واضح طور پر ایک سوال پیدا کرتا ہے کہ:

کیا وہ انسانی جستجو کے سیکولر (Secular) تصور سے اختلاف کرتی ہیں؟

کیونکہ ان کے نزدیک جستجو جب روحانیت سے دور ہوتی جاتی ہے، تو اس کے اثرات تباہ کن ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سائنس کی جدید ایجادات، خصوصاً اسلحہ سازی کے میدان میں پیش رفت، انسانیت کے مستقبل کو تاریکی میں دھکیل رہی ہے۔ حجاب امتیاز علی نے اپنے ناول "پاگل خانہ" میں سائنسی تجربات کے تناظر میں یہی تصور پیش کیا ہے کہ ایک عظیم ایٹمی جنگ وہ قیامت بن سکتی ہے جس کا تذکرہ ہمارے مذہبی عقائد میں ملتا ہے۔

یوں بانو قدسیہ دراصل جستجو کو ایک روحانی سمت دینے کی خواہش رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک جستجو کو حدود میں رکھنا ضروری ہے تاکہ انسان اپنی کاوشوں کے ذریعے حق کے قریب ہو سکے۔ اگر وہ روحانیت کے دائرے میں رہ کر تلاش کرے، تو وہ اپنی موجودہ کم مائیگی سے نکل کر زمان و مکان سے ماورا بلندی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ بلندی جسے تصوف بھی ابدیت کے نام سے یاد کرتا ہے۔

اسی تناظر میں پروفیسر قیوم ناول کے آخری حصے میں کہتا ہے:

> "پہلے انسان اپنی تلاش کرتا تھا یا خدا کی۔ اس کی جستجو بے نام نہیں ہوتی تھی۔ اب آج کا ماڈرن انسان یہ بھی نہیں جانتا کہ آخر اسے تلاش کس چیز کی ہے؟ پھر وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ کہیں کوئی سادہ سا علاج ہے جو اُسے سکون دے سکتا ہے۔"(12)

پروفیسر قیوم یہاں پیغمبروں کی زندگیاں بطور مثال پیش کرتا ہے، جو عظیم مشن لے کر اس دنیا میں آئے اور کسی بھی ابتلا یا آزمائش کے باوجود اپنی راہ سے نہیں ہٹے۔ بانو قدسیہ کے نزدیک یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسانی جستجو بے نام یا بے مقصد نہیں ہونی چاہیے۔ زندگی میں ایک مشن ہونا چاہیے، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔

مگر آج کا انسان اس کے بالکل برعکس چل رہا ہے۔ اس کی جستجو پست مقاصد اور مادی فوائد پر مبنی ہے۔ وہ مکر، حیلہ جوئی، اور دھوکے سے کماتا ہے، اپنے بھائی کا حق غصب کرتا ہے، اپنوں کے خلاف غیروں سے ساز باز کرتا ہے، اور حرام روزی حاصل کرنے کے لیے بے شمار چالاکیوں سے کام لیتا ہے۔ وہ بانٹ کر نہیں کھاتا بلکہ چھین کر کھاتا ہے، اور اسے ناجائز طریقوں کے اتنے ہنر آ گئے ہیں جتنے چیل کو گھونسلہ بنانے کے آتے ہیں۔

پروفیسر سہیل کا نقطۂ نظر اس سارے تناظر میں نہایت اہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان پہلے یا تو اپنی تلاش میں ہوتا تھا یا اپنے خدا کی تلاش میں۔ لیکن آج وہ دونوں سے کٹ چکا ہے۔ وہ جس بے سمتی، عشقِ لاحاصل، اور بے مقصد جستجو میں مبتلا ہے، اسی نے اسے اخلاقی زوال، روحانی پستی، اور گناہ کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے بانو قدسیہ کے نزدیک انسان کی مراجعت (واپسی) ناگزیر ہو جاتی ہے یعنی اسے دوبارہ اپنی روحانی اصل کی طرف لوٹنا ہوگا۔ یہ مراجعت اس وقت اپنے دائرے کو مکمل کر سکتی ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان صرف ایک مادی وجود نہیں بلکہ ایک روحانی حقیقت بھی ہے۔ جب روحانی حقیقت کو انسانی وجود کے بنیادی عنصر کے طور پر مان لیا جائے گا تو یہ یقین بھی مستحکم ہو جائے گا کہ انسان کی زخمی اور بے سکون روح کا علاج بھی روحانیت ہی کے دامن میں پوشیدہ ہے۔ بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ میں اسی تصور کو فکری اور علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں دو طرح کی دیوانگی کا ذکر آتا ہے: ایک وہ جو جسم کو کمزور اور روح کو مفلوج کر دیتی ہے، اور دوسری وہ جو مثبت دیوانگی ہے۔ یعنی اکلِ حلال کی جانب رغبت، ذکرِ الٰہی اور رب کی ثنا جو روح میں توانائی اور حرکت پیدا کرتی ہے۔ یہی روحانی جست بانو کے مخصوص نظریۂ حیات کو مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے اور ان کے پورے ناول کی فکری اساس بن جاتی ہے۔

بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" کا یہ منظر روحانیت، اخلاقی زوال اور انسانی وجود کے باطنی اضطراب کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ مزار کا ماحول، قوالوں کی آوازیں، بہار کی نرم فضا اور امثل کا خاموش رونا سب مل کر ایک ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں جس میں انسان اپنی زندگی، محبت اور گناہ کے بوجھ سے مکالمہ کرتا ہے۔ قیوم کا کردار یہاں اپنی گم

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 04 (2025)

شدہ روحانی شناخت کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر اس تلاش میں اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ اور اخلاقی کمزوری نمایاں ہو جاتی ہے۔ بانو قدسیہ نے اس منظر کے ذریعے یہ دکھایا ہے کہ انسان جب دنیاوی محبت، خواہشات اور خود غرضی میں ڈوب جاتا ہے تو اس کی روح پژمردہ ہونے لگتی ہے، اور نجات صرف سچے احساس، خلوص اور روحانی بیداری سے ممکن ہے۔

> ''بس یہی ..... یہی سرجی نہ زندگی تو کسی پیار کرنے والے کے سہارے گزاری نہیں، اب موت تو کسی پیارے کے ہاتھوں آئے۔ ہم دونوں مزار کے قرب میں پہنچ کر چپ ہو گئے۔ ساری فضا قوالی کے اولین کسری سے بُو محل تھی، اور بہار کے دنوں میں مزاروں کی فضا آنسوؤں سے سسکنے لگتی ہے۔''(13)

یہ اقتباس روحانی سکون کی جستجو اور انسانی زوال کا گہرا اشارہ دیتا ہے۔ امثل کی دعا میں محبت کی پاکیزگی ہے لیکن اس کے پس منظر میں انسانی بے بسی اور تنہائی کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ قیوم اور امثل کی خاموشی دراصل روح کے اندر ہونے والی چیخ ہے، جو ظاہری محبت کے باوجود اخلاقی خلا کو پُر نہیں کر پاتی۔ بانو قدسیہ نے اس لمحے میں دکھایا ہے کہ انسان جب اپنی ذات سے اوپر اُٹھ کر محبت کو عبادت بنا لیتا ہے، تبھی وہ روحانی نجات کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

بانو قدسیہ کے ناول کے آگے چل کے پھر روحانی سفر کو ایک اور نظر سے پیش کرتی ہیں۔ دراصل انسانی روح کے انجام، مرنے کے بعد کے مرحلے، اور روح کے قید ہونے کے استعارے کے ذریعے انسان کی اندرونی گمراہی اور نجات کی جستجو کو ظاہر کرتا ہے۔ بانو قدسیہ نے اس تمثیل میں ''سچے'' اور ''جھوٹے'' آدمی کے کرداروں کے ذریعے حقیقت اور فریب کے ازلی تصادم کو واضح کیا ہے۔ جھوٹا آدمی دنیاوی لذتوں، خود فریبی اور نفس کی نمائندگی کرتا ہے، جو انسان کو یقین نہیں کرنے دیتا کہ وہ فنا کے سفر پر ہے، جب کہ سچا آدمی حقیقت، ایمان، اور روحانی سچائی کا نمائندہ ہے جو انسان کو اس کے باطنی زوال سے آگاہ کرتا ہے۔

> ''جب النسان مرتا ہے تو دو آدمی مردے کے پاس آتے ہیں۔۔۔ ایک جھوٹا ہوتا ہے اور ایک سچا۔۔۔ جھوٹے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں اس گریب میں مبتلا رکھے کہ تم نہ مرو، اور ابھی تمہاری روح واپس جسدِ خاکی میں چلی جائے گی۔۔۔ سچے آدمی کو یہ مشکل در پیش ہوتی ہے کہ کس طرح آپ کو یہ یقین دلائے کہ آپ مر چکے ہیں۔''(14)

یہ اقتباس انسانی زندگی کے اس روحانی بحران کی نمائندگی کرتا ہے جہاں انسان حقیقت سے انکار کر کے جھوٹ کی تسلی میں زندہ رہتا ہے۔ روح کے ''گلابی ڈبوں'' میں بند ہونے کا استعارہ اس بات کی علامت ہے کہ گناہ، حرص، اور نفس پرستی انسان کی روح کو محدود کر دیتے ہیں، اور وہ نجات (روشن روحانی بیداری) حاصل نہیں کر پاتی۔

مصنفہ نے ''دریائے نیستاں'' اور ''روحوں کے قبرستان'' کا ذکر کر کے انسان کی اس ناکامی کو دکھایا ہے کہ وہ روحانی ارتقاء کے بجائے زوال کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔

> ''وہ سارے ڈبے پھینک دیتا ہے جن میں روحیں مقید ہوتی ہیں۔۔۔ کئی لوگ صدیوں میں یہ ڈبہ نہیں کھول سکتے، کچھ ایسے بد نصیب بھی ہوتے ہیں جو نیچے سطح پر جا پہنچتے ہیں۔۔۔ یہ روحوں کا قبرستان ہے، یہ روحیں قیامت تک وہیں بند سیپیوں کی طرح منتظر رہیں گی۔''(15)

یہ روحانی قبرستان دراصل انسان کے اندر کے اخلاقی اور روحانی جمود کی علامت ہے، جہاں گناہ، لالچ، اور خواہشات نے روح کو مفلوج کر رکھا ہے۔ آخر میں گدھ کی موت کا استعارہ اسی انحطاط کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے —— وہ لمحہ جب انسان گناہ سے بیزار تو ہوتا ہے مگر توبہ کی توفیق نہیں پاتا۔

ناول کے اختتام پر قیوم کی شخصیت میں تبدیلی نمایاں ہوتی ہے۔ وہ اپنے ابنارمل (مافوق العادت) بچے افراہیم کو ماہرِ نفسیات کے پاس علاج کے لیے لاتا ہے۔ اس کردار کی آمد دراصل ایک نئے فکری بُعد (Dimension) کو متعارف کراتی ہے جو ناول کی تمام فکری و علامتی بحث کو تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ آفتاب کا یہ سوچنا کہ شاید ان کے آباؤ اجداد نے حرام رزق کما کر اپنے وجود کو آلودہ کیا تھا، اور اب افراہیم اسی کا کفارہ بن کر ان کے سامنے کھڑا ہے، بانو قدسیہ کے اخلاقی و روحانی تصورات کو گہرائی عطا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ابنارمل بچہ ہمارے بگڑے ہوئے معاشرتی رویوں کی علامت ہے جو منفی دیوانگی سے مثبت دیوانگی کی طرف جست لگانے کی بے تابی رکھتا ہے۔ افراہیم اپنی اسی روحانی کیفیت میں چیخ اُٹھتا ہے:

> ''ابو آپ کو نظر نہیں آتا وہ گنبد۔ اس کے Dome کے نیچے چودہ طاق ایک طرف۔۔۔ اور دیکھیے وہ کبوتر اڑ رہے ہیں۔ مدینے کی سڑکوں پر لوگ بھاگ رہے ہیں اس گنبد کی طرف۔۔۔۔ روسی، امریکی، افریقی۔۔۔۔ اذان ہو رہی ہے ابو۔''(16)

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 04 (2025)

کچھ دیر بعد افراہیم کانپتا ہے اور منہ کے بل سجدے میں گر جاتا ہے۔ اس طرح وہ خوابوں کی آخری سیڑھی پر سربسجود ہو کر روحانی جست کی علامت بن جاتا ہے۔ یہی خواب دراصل اس معاشرے کی اجتماعی آرزوؤں اور امیدوں کی تعبیر ہیں، جنہیں بانو قدسیہ نے اپنے مخصوص نظریاتی عزم (Committed Vision) کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا یہ کمٹ مینٹ دراصل امید پرستی اور روحانی احیاء پر مبنی ہے۔ خواب خود امید کا حصہ ہوتے ہیں، اور انسان کی فطرت میں یہ بات مضمر ہے کہ وہ حالات کی خرابی کے باوجود مستقبل میں سکون و اطمینان کی تمنا کرتا ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جو راجہ گدھ کو محض ایک سماجی یا نفسیاتی ناول کے بجائے ہماری اپنی روحانی جڑوں کی تلاش کا ناول بنا دیتا ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنی فکری جہت کو تصوف، روحانیت، اور اخلاقی قدروں کے ساتھ جوڑ کر ایک جرأت مندانہ فکری مہم جوئی کی ہے۔ یہ ناول ایک طرف ہماری تہذیبی اور نظریاتی اساس کی نمائندگی کرتا ہے تو دوسری طرف سیکولر فکر کے مقابلے میں روحانی اقدار سے ربط پیدا کرتا ہے۔

بانو قدسیہ نے ناول کے پلاٹ کو دو جہتوں میں تقسیم کیا ہے۔ جنگل کی عدالت اور انسانوں کی دنیا جو ان کے نظریاتی کمٹ مینٹ کی گہرائی اور معنویت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ طرزِ حکایت ہمارے قدیم ادبی سرمائے میں موجود ان حکایتی روایات سے جڑا ہوا ہے جن میں انسانی رویوں، اخلاقی اقدار اور روحانیت کی اہمیت کو علامتی پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔

راجہ گدھ میں بانو قدسیہ نے ایک سطح پر اپنے کرداروں کو عشقِ لاحاصل، گناہ، اور دیوانگی کے گہرے جوہڑ میں مبتلا دکھایا ہے، اور دوسری سطح پر جاگتے ضمیر، خیر و شر کی ابدی کشمکش، اور حیات و موت کی علامتوں کے ذریعے انسانی ارتقاء کی پوری داستان رقم کی ہے۔ ان کا اسلوب مغربی علامتی روایت سے قریب ہے، جہاں جانوروں اور پرندوں کو سب پلاٹ (Sub-Plot) کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان کے کرداروں کے افعال ایک محدود سطح سے بلند ہو کر عالمی انسانی شعور کا احاطہ کرتے ہیں۔

یوں راجہ گدھ کا کینوس ایک وسیع فکری و روحانی منظر نامہ تشکیل دیتا ہے، جس میں ماضی اور حال، خیر و شر، اخلاقی زوال اور روحانی جستجو سب سمٹ آتے ہیں۔ اس اعتبار سے راجہ گدھ نہ صرف بانو قدسیہ کا اہم ناول ہے بلکہ اردو ادب میں روحانیت، اخلاق، اور انسانی شعور کے امتزاج کا ایک قابلِ قدر استعارہ بھی ہے۔

راجہ گدھ کا بیانیہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ مادی آسودگی، علمی ترقی اور سماجی حیثیت انسان کو روحانی سکون نہیں دے سکتیں۔ بانو قدسیہ نے یہ باور کرایا کہ جدید تہذیب میں اخلاقی اصولوں سے انحراف اور حرام رزق کی طرف میلان ہی وہ اصل سبب ہے جس سے انسان کی روح بیمار اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ ناول میں قیوم کی شخصیت علامتی طور پر اس معاشرے کی نمائندہ ہے جو محبت کے نام پر خود غرضی، لالچ اور حرص میں مبتلا ہے۔ سیمی شاہ جیسے کردار کی شکست اور افراہیم جیسے معصوم بچے کا "ابنارمل" ہونا اس بات کا اشارہ ہے کہ معاشرہ خود اپنی روحانی معذوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اس تناظر میں راجہ گدھ ایک فکری احتجاج بھی ہے جو بظاہر انفرادی المیے کے ذریعے اجتماعی اخلاقی بحران کو بے نقاب کرتا ہے۔

بانو قدسیہ کا یہ ناول محض ادبی تخلیق نہیں بلکہ ایک فکری مہم جوئی بھی ہے۔ اس میں مصنفہ نے روحانیت کو محض مذہبی عقیدہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی و وجودی فلسفہ کے طور پر پیش کیا ہے جو انسان کو مادی گراوٹ سے نکال کر باطنی تطہیر کی راہ دکھاتا ہے۔ ناول کے اختتام پر افراہیم کا سجدہ اور مدینہ کے گنبد کا تصور اس روحانی جست کی علامت ہے جو انسان کو منفی دیوانگی سے مثبت دیوانگی یعنی عشقِ الٰہی کی طرف لے جاتی ہے۔ یوں راجہ گدھ بانو قدسیہ کے فکری وژن کی نمائندگی کرتا ہے جو ادب میں تصوف، اخلاقیات اور سماجی شعور کو یکجا کر کے ایک ایسا بیانیہ تشکیل دیتا ہے جو نہ صرف اردو ناول کی روحانی سمت کو متعین کرتا ہے بلکہ قاری کو اپنے باطن کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور بھی کرتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1981، ص 65

2۔ ایضاً، ص 68

3۔ ایضاً، ص 113

4۔ ایضاً، ص 119

5۔ ایضاً، ص 161

6۔ ایضاً، ص 277

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 04 (2025)

7۔ایضاً، ص276

8۔ایضاً، ص413

9۔ایضاً، ص420

10۔ایضا، ص344

11۔ایضاً، ص534

12۔ایضاً، ص543

13۔ایضاً، ص435

14۔ایضاً، ص500

15۔ایضاً، ص523

16۔ایضاً، ص563